اشارات

۱۴ اگست کو ہم ایک اور یومِ آزادی منائیں گے۔ ہر ملک کو ہر وقت عام نوعیت کے مسائل اور خطرات درپیش رہتے ہیں۔ لیکن چار دہائیوں سے زیادہ عرصہ کی طویل مہلتِ عمل کے بعد' آزادی کی اس سالگرہ کے موقع پر' پاکستان جن سنگین مسائل اور مہیب خطرات سے دو چار ہے' ان کی نوعیت بالکل ہی دوسری ہے۔ استحکام' سلامتی اور بقا سب داؤں پر لگے ہوئے ہیں۔ ہر چیز کے مستقبل پر' یہاں تک کہ ملک کے مستقبل پر بھی' بے یقینی کے گہرے کالے سائے چھائے ہوئے ہیں۔ کل کیا ہوگا؟ کوئی یقین کے ساتھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ لیکن کوئی سنگین سے سنگین بات بھی ایسی نہیں رہ گئی جس کا ہونا ناقابل تصور یا خارج از امکان سمجھا جاتا ہو۔ سیاسی نظام تلپٹ کیا جا سکتا ہے' امن و امان تہ و بالا ہو سکتا ہے' خون ریزی کی آگ بھڑک اٹھ سکتی ہے' فوج اور قوم باہم دست بگریباں ہو سکتے ہیں' ملک لخت لخت ہو سکتا ہے۔ ملک کی کشتی یقین کے بجائے شک' امید اور حوصلہ کے بجائے یاس و ہراس' اتحاد کے بجائے افتراق' اور دیانت و وفا کے بجائے بد دیانتی' لوٹ کھسوٹ اور بے وفائی کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے۔

ایسے وقت میں' جشن منانے کے بجائے خود احتسابی' اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا اعتراف' اپنی حالت میں تغیر و اصلاح کی سعی و جہد اور اپنے رب کی طرف رجوع ہی یوم آزادی منانے کا صحیح طریقہ ہے۔

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ (ھود ۱۱ : ۵۲)

اور اے میری قوم کے لوگو' اپنے رب سے معافی چاہو' پھر اس کی طرف پلٹو' وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔

خود احتسابی استغفار کی بنیاد ہے' اور اس کا لازمی جز بھی۔ زبان پر استغفر اللہ کے ورد کے

باوجود' پرائیویٹ زندگیوں میں بھی استغفار کا اہتمام بہت کم ہے' لیکن پبلک زندگی میں اور اجتماعی اعمال میں تو یہ بالکل عنقا ہے۔ کوئی پبلک عہدیدار نہ اپنے کسی غلط کام کی ذمہ داری قبول کرتا ہے' نہ وہ عدالت کے سامنے حاضر ہوتا ہے' نہ کبھی اسے قرار واقعی سزا ملتی ہے۔ وہ عام انسانوں پر بدترین زیادتیوں کا مرتکب ہوتا ہے--- بشمول بے گناہ خون' آبروریزی اور لوٹ کھسوٹ کے --- لیکن نہ اس سے قصاص لیا جاتا ہے' نہ اس سے رشوت اور لوٹ مار کا مال ضبط ہوتا ہے' جب کہ اسلامی قانون کے تحت دونوں سزائیں واجب ہیں۔ سزائیں تو دور رہیں' کسی کے ضمیر میں اتنی خلش بھی نہیں ہوتی جو اسے پبلک عہدوں سے مستعفی ہو جانے پر مجبور کردے۔

لیکن اس وقت ہمارے پیشِ نظر افراد کے پبلک افعال کا جائزہ بھی نہیں' کہ ان کی تفصیل بہت طویل ہے۔ ہم اپنی توجہ پبلک لائف کے صرف ان چند اجتماعی پہلوؤں پر مرکوز کرنا چاہتے ہیں' جن کا آج کے بگاڑ میں سب سے زیادہ دخل ہے۔ اور جن کی اصلاح کی فکر پوری قوم اور اس کی قیادت کو کرنا چاہیے۔

آج اگر ہر زبان پر اور ہر اخباری کالم میں مارشل لا کا ذکر ہے' ہر طرف یہ سوال ہے کہ موجودہ حکومت کب جارہی ہے' کیا مارشل لا آرہا ہے' یا کوئی نیا سیاسی نظام بننے والا ہے جس کا چہرہ سیاسی ہوگا لیکن جس کی ڈوری فوج کے ہاتھ میں ہوگی' تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اگر فوج کی طرف سے بار بار اعلانات ہوتے ہیں کہ ہم سول حکومت کے تابع ہیں اور ہماری دلچسپی ملک کے دفاع کے پیشہ ورانہ فرائض تک محدود ہے' وزیراعظم مارشل لا کے لفظ کے استعمال کو بھی ممنوع قرار دینے کے لیے کوشاں ہیں' مگر لوگوں کو یقین نہیں آتا' بلکہ سوالات اور اندیشے اور زیادہ زور پکڑتے جارہے ہیں' تو اس پر بھی انہیں تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ہماری تقریباً نصف صدی کی سیاسی تاریخ نے جو نقوش قوم کے حافظہ اور نفسیات پر مرتسم کردیے ہیں' اور ہمارے فوجی جنرلوں' سول بیوروکریٹوں اور سیاست دانوں نے جو مسلسل روایات قائم کی ہیں' وہ یہی ثابت کرتی ہیں کہ حکومتوں کا جانا اور مارشل لا کا آنا اس ملک کا معمول ہے۔ اس وجہ سے کسی وقت بھی' اور خاص طور پر آج سندھ میں فوجی آپریشن کے مسئلہ پر حکومت اور فوج کے درمیان آویزش کے حوالے سے' اس ملک میں مارشل لا کا آنا لوگوں کو عین قرینِ قیاس لگتا ہے۔ کوئی حکومت ٹھہر جائے اور اپنی مدت پوری کرلے' یہ ایک انہونی بات لگتی ہے۔ اس لیے کہ اس کی کوئی نظیر ہماری تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ سوائے مسٹر بھٹو کی حکومت کے۔ لیکن وہ خود

"سول" چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی رہے' ان کے وقت میں فوج مشرقی پاکستان میں شکست کا داغ بھی اٹھائے ہوئے تھی' اور وہ وزیراعظم کا لقب اختیار کرنے کے باوجود' صدر کو بے اختیار کرکے خود ہی صدر بھی تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی مدت پوری کرلینے کی جسارت کی بہت بھاری قیمت بھی ادا کی۔

اپریل ۱۹۵۳ میں خواجہ ناظم الدین کی برطرفی گورنر جنرل کے حکم سے ہوئی' اور سیّد مودودیؒ کے الفاظ میں "یہ تھا وہ مقام جہاں سے ہماری تاریخ کا کانٹا بدلا"... "آئین اور آئینی روایات کو توڑنے کا آغاز ہوگیا"... غلام محمد کو اتنا غیر معمولی اور دور رس غیر آئینی اقدام کرنے کی جرات کیسے ہوئی' اور وہ اس میں کیوں کامیاب ہوئے؟ اس لیے کہ کمانڈر انچیف جنرل ایوب خاں آئین کے محافظ ہونے کے بجائے گورنر جنرل کے پشتیبان تھے' سروسز آئین کے بجائے کمانڈر انچیف کی مطیع تھیں' اور قوم میں مضبوط عزم و ارادہ اتنا مفقود تھا کہ وہ آئین کی حفاظت کے لیے جنبش کرنے کو تیار نہ تھی۔

ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ۱۹۵۳ میں جو گاڑی پٹڑی سے اتری تھی' وہ آج تک پھر پٹڑی پر واپس نہیں آسکی ہے۔ ۱۹۵۳ کی کہانی مسلسل دہرائی جاتی رہی ہے' اگرچہ کردار بدلتے رہے ہیں اور ان کے مقام بھی۔ "ایوب خاں" اگر کبھی پس پردہ اور بالواسطہ کار فرما رہے' تو کبھی عیاں اور بلاواسطہ۔ اس ریل کے اسکرین پر مسلسل چلتے رہ سکنے کے اسباب بھی تقریباً وہی رہے ہیں جو ۱۹۵۳ میں تھے۔ اور دلائل بھی وہی دہرائے جاتے رہے ہیں' (۱۹۵۳ کا پریس نوٹ پڑھ لیں یا ۱۹۹۰ کا): ملک کی سلامتی اور استحکام' امن و امان اور نظم و نسق کی ابتری' سیاست دانوں کی نا اہلی اور لوٹ کھسوٹ۔

مارشل لا آئے گا' اس پر فوراً یقین اس لیے آجاتا ہے کہ پاکستان بیشتر مدت' براہ راست یا بالواسطہ' مارشل لا کے تحت رہا ہے۔ ۱۹۵۸ سے ۱۹۷۱ تک ایوب خاں اور یحیٰی خاں' اور ۱۹۷۷ سے ۱۹۸۸ تک جنرل ضیاء الحق حکمراں رہے ہیں۔ ۱۹۵۳ سے ۱۹۹۰ تک وزرائے اعظم اس لیے برخواست ہوتے رہے کہ جنرل' صدر تھے یا صدر کے ساتھ تھے۔ ۱۹۶۲' ۱۹۷۱' ۱۹۸۵' ۱۹۸۸ میں الیکشن اس لیے نہیں ہوئے کہ یہ قوم کا حق تھا' بلکہ اس لیے ہو سکے کہ اصل حکمران قوم کو یہ "عطیہ" مرحمت کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۵۳ سے ۱۹۹۰ تک جنرلوں اور صدور کے غیر آئینی اقدامات کو عدالتوں سے سند جواز اس لیے نہیں ملتی رہی کہ یہ آئین و قانون کے مطابق تھے' بلکہ اس لیے کہ فراستِ عملی یہی کہتی تھی۔ آخر اسلحہ سے لیس قابض کو کاغذ کا ایک پروانہ کیسے بے دخل کر

سکتا تھا! ہاں، جب قابض فوت ہو گیا، تو پہلی دفعہ اس کا اقدام غیر قانونی ٹھہرا، کہ بے دخل تو اس کو قدرت کر چکی تھی۔

حکومت چلی جائے گی، یہ قیاس افواہ سے زیادہ حقیقت اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے۔ جیسا ہم نے کہا، پاکستان کی پوری تاریخ میں، ماسوا ایک کے، کسی حکومت کے ٹھہرنے کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ صدر اور وزیراعظم کے درمیان تقسیمِ اقتدار کی آویزش سیاسی عدم استحکام کا ایک اہم منبع ہے۔ اس آویزش میں ہمیشہ صدر ہی کو فتح نصیب ہوئی ہے، (جو جنرل رہا ہے یا بیوروکریٹ)۔ ملک میں دستوری طور پر بھی پارلیمنٹری سسٹم بہت تھوڑے عرصہ رہا ہے (اس لیے کہ دستور ہی بہت تھوڑے عرصہ کے لیے نافذ رہا ہے)، لیکن پارلیمنٹری سسٹم کے چہرہ کے پس پردہ بھی صدر کی بالادستی قائم رہی ہے۔ پہلے یہ خیال تھا کہ یہ آویزش دراصل پنجاب اور بنگال کے درمیان بالادستی کی آویزش کا شاخسانہ ہے۔ پھر بنگال کا کانٹا بھی نکل گیا، مگر یہ آویزش نہ گئی۔ معلوم ہوا کہ دراصل یہ ملٹری اور سول بیوروکریٹ اور سیاستداں کے درمیان کشمکش کا نتیجہ ہے۔ بنگال صرف اس لیے فریق بن گیا تھا کہ اس کے پاس نہتا اور بے اختیار سیاست داں ہی تھا، جنرل اور بیوروکریٹ نہ تھا۔ (جب بنگال کے پاس یہ "جنس" دستیاب ہو گئی، تو بنگلہ دیش بھی اسی آویزش کا شکار ہو گیا)۔

شیخ مجیب الرحمٰن کو اگر اسلام آباد آکر عنانِ حکومت سنبھالنے کی جرات نہ ہوئی، (جو پیش بھی نہ کی گئی)، تو اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھی کہ انہوں نے (تاریخی تجربات کی روشنی میں) اسی میں عافیت سمجھی۔ ورنہ آخر ان کا حشر خواجہ ناظم الدین، سہروردی، فیروزخان نون، بھٹو، جونیجو اور بے نظیر سے مختلف کیوں ہوتا۔ ان کے ایک قریبی رفیقِ کار کے کہنے کے مطابق "بائیس منہ زور گھوڑوں پر کیسے سوار ہوں؟" جنرل ضیاء الحق نے اپنی پسند کے غیر جماعتی انتخابات کرائے، ان کی خوش قسمتی تھی کہ پیپلزپارٹی نے بائیکاٹ کیا، ان کی پسند کی اسمبلی آئی، انہوں نے خود وزیراعظم نامزد کیا، لیکن ان کی گزر نہ اپنے وزیراعظم کے ساتھ ہو سکی، نہ اپنی اسمبلی کے ساتھ۔

میاں نواز شریف نے اگر وزیراعظم بنتے ہی آٹھویں ترمیم کے شکنجہ سے نکلنے کے لیے کسمسانا شروع کر دیا، اور بارھویں ترمیم جیسی بھونڈی تدبیر اختیار کی، تو یہ فطری ردِعمل تھا، مگر تھا غیر دانشمندانہ۔ ۴۰ سالہ تاریخ کو کیسے دریا برد کیا جا سکتا ہے۔ اس کشمکش میں وہ جیت نہیں سکتے، اِلّا یہ کہ "راولپنڈی" ان کی پشت پر آجائے۔ وہ اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کرتے ہیں تو صحیح کرتے ہیں، مگر اس سے پہلے تو وہ ایک صوبہ کے وزیراعلیٰ ہوتے ہوئے، اپنے صوبہ کی طرف

سے بھی، اور مرکزی مقتدرین کی طرف سے بھی، ملک کی وزیراعظم کو بے دست و پا کرنے کا کارنامہ خود انجام دے چکے ہیں۔

جب تک صدر اور وزیراعظم کے درمیان توازن صحیح خطوط پر قائم نہ ہوگا، دستوری طور پر بھی اور واقعتاً" بھی، سیاسی نظم مستحکم نہیں ہو سکتا۔ وزیراعظم کے آتے ہی اس کا جانا ٹھہر جائے گا، اور وہ مسلسل ان افواہوں کی زد میں رہے گا کہ اب گیا، اور اب گیا۔

دستور ہوتا تو ایک کاغذ کا ٹکڑا ہی ہے، لیکن روایات اور کردار کے بل پر اس کا وزن ملک میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ مجرّد نظام پر سیاسی استحکام کا سارا دارومدار نہیں ہوتا، لیکن اس استحکام میں سیاسی نظام کا رول کلیدی ہے، اور سیاسی نظام میں دستور کا، خصوصاً" جہاں نہ روایات ہوں، نہ روایات کی پاس داری۔ مگر آج پاکستان میں دستور کا وزن کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں رہ گیا ہے۔ اس کو کوئی بھی طالع آزما جب چاہے، قوت کے بل پر، پھاڑ کے پھینک سکتا ہے، معطل کر سکتا ہے، یا اس میں من مانی تبدیلیاں کر سکتا ہے۔

ہمارا پہلا دستور ۹ سال میں بنا، اور دو سال ہی میں اس وقت کے صدر اور کمانڈر انچیف نے اسے اٹھا کر پھینک دیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ کا دستور قومی نمائندوں نے نہیں بنایا، بلکہ ایک فردِ واحد نے اسے قوم پر مسلط کر دیا۔ ۱۹۶۹ میں اگرچہ یہ دستور نافذ تھا، لیکن خالقِ دستور نے انتقالِ اقتدار، دستور کے مطابق نہیں بلکہ مارشل لا لگا کر کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خاں کو کیا۔ پھر اس کمانڈر انچیف نے انتخابات تو کرائے، مگر انتخابات سے پہلے اپنی مرضی سے دستور میں اتنی بنیادی اور دور رس تبدیلیاں کر دیں کہ بالکل ایک نیا دستور وجود میں آگیا۔ ون یونٹ توڑ دیا، اور مشرقی اور مغربی پاکستان میں مساوات کا اصول ختم کر دیا۔ اس طرح بار بار دستور توڑنے پھوڑنے اور مارشل لا لگاتے رہنے نے بالآخر ملک کو دو ٹکڑے کر دیا۔

۱۹۷۳ کا دستور اگرچہ مارشل لا جاری رکھنے کی دھمکی کے تحت بنا، پھر بھی اس پر بڑی حد تک اتفاق رائے ہو ہی گیا تھا۔ مگر چار سال میں مسٹر بھٹو نے پے در پے ترمیمات کرکے اس کے ڈھانچہ میں بنیادی تبدیلیاں کر دیں۔ پھر جنرل ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے اس میں مزید ترمیمات کرکے ۱۹۷۳ کے دستور کا حلیہ ہی بدل دیا۔ ان ترامیم کو، ان ہی کی مرضی کے مطابق منتخب شدہ اسمبلی کو، ایک دفعہ پھر مارشل لا کی لٹکتی تلوار کے سائے تلے، آٹھویں ترمیمی بل کی صورت میں دستور کا حصہ بنانا پڑا۔

اس تاریخی پس منظر میں، اگر آج دستور کی بقا مشتبہ ہے، اور قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں کہ

کوئی بالکل نیا ہی سیاسی نظام آنے والا ہے' تو بالکل بجا ہے۔

پاکستان میں کوئی ہوش مند انسان یہ پیشین گوئی کرنے کی جرات نہیں کر سکتا کہ یہاں مارشل لا نہیں لگے گا۔ لیکن موجودہ قومی اور بین الاقوامی حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم یہ کہنے میں حرج نہیں سمجھتے کہ ہمارے نزدیک' بوجوہ' فی الحال مارشل لا کے آنے کے کچھ زیادہ امکانات نہیں ہیں۔ پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ جو لوگ مارشل لا لگانے کا سوچ سکتے ہیں وہ اس بات کو بخوبی سمجھ لیں کہ آج تک مارشل لا کے بطن سے سوائے مفاسد کے اور کسی چیز نے جنم نہیں لیا ہے۔ ایوب خاں کا مارشل لا ختم ہوا تو بنگلہ دیش اور ذوالفقار علی بھٹو کے "تحفے" قوم کو دے کر گیا۔ پھر جس بھٹو کی پوری پرورش مارشل لا کے تحت ہوئی تھی' وہ جمہوریت کو بھی مارشل لا کے سانچہ میں ڈھال کر ہی چلا سکتا تھا۔ جنرل ضیاء الحق کا مارشل لا گیا' تو بے نظیر بھٹو' نواز شریف (جن کو وہ اپنی عمر بھی دے گئے ہیں)' لوٹ کھسوٹ میں مشغول عوامی نمائندے' اور سندھ میں ایم کیو ایم اور تباہ حال امن و امان کا ورثہ چھوڑ گیا۔ ملک کی سلامتی کی دہائی دے کر آنے والا مارشل لا گیا' تو ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔ استحکام کے نام پر آنے والے گئے' تو آج ملک بدترین عدم استحکام اور اندیشوں کا شکار ہے۔ ملک میں اقتدار کے تینوں سرچشمے باہم دست بگریباں ہیں۔ امن و امان ہو' نظم و نسق ہو' تعلیم ہو' قومی کردار ہو' ہر طرف انحطاط اور فساد کا راج ہے۔

آپ برا نہ مانیں تو کہوں کہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہم نے ۱۹۴۷ میں آزادی حاصل تو کرلی' مگر ہمارے اندر قومی حیثیت سے وہ ابتدائی اوصاف بھی پیدا نہیں ہوئے جن کی بدولت کوئی قوم اپنی آزادی برقرار رکھ سکتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ [یہی] وجہ ہمارے لیے ماتم کا اصل مقام ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہمارے ہاں آئین اور نظم کی اطاعت اور قانون کی حکمرانی کا بالکل ابتدائی تصور تک موجود نہیں ہے۔ ہمارے افراد کو' جن میں بڑے بڑے عالی مقام لوگ شامل ہیں کوئی ایسی تعلیم و تربیت نہیں ملی ہے جس نے ان میں کوئی قومی کیریکٹر پیدا کیا ہو۔ انہیں اپنے متعلق یہ غلط فہمی ہے کہ وہ بڑے مہذب (cultured) لوگ ہیں' حالانکہ تہذیب محض انگریزی بگھارنے اور انگریزوں کے سے کپڑے پہننے اور انہی کی طرح سے رہنے سہنے کا نام نہیں ہے' بلکہ آئین و قانون کی پابندی' نظم و ضبط اور اپنے حدود کو

سمجھنے اور ان سے تجاوز نہ کرنے کا نام ہے۔ اور اس اعتبار سے بیسویں صدی کی اس تیسری چوتھائی میں بھی یہ لوگ تہذیب کے اس مقام تک نہیں پہنچے ہیں جس پر اٹھارہویں صدی کے وسط میں انگریزی قوم کا ایک معمولی ٹامی فائز تھا۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

یہ المیہ ہے ہمارے موجودہ مسائل کی اصل جڑ۔

کیریکٹر کے چند پہلو بنیادی ہیں' اور چند کا تعلق ہماری موجودہ صورت حال سے ہے جن کی فوری فکر کرنا ضروری ہے۔

جو پہلو فوری توجہ کے مستحق ہیں' ان میں سب سے اہم قومی زندگی کے بنیادی اصولوں پر اتفاقِ رائے' ان کا احترام اور ان کو تنازعات کے دائرہ سے باہر رکھنا ہے۔ ہماری نظر میں ان اصولوں میں سب سے زیادہ اہم یہ ہیں۔

(۱) اسلام کی بالاتری' اور تمام تنازعات میں اس کو حَکَم تسلیم کرنا۔ اس میں اسلام کی کوئی ایک تعبیر ماننا ضروری نہیں' بلکہ من حیث المجموع اسلام کے اس مقام کو تسلیم کرنا ہے۔

(۲) پاکستان کی سالمیت کا تحفظ

(۳) عدل و قسط کا قیام

(۴) صوبائی خود مختاری کا فی الواقع قیام

دوسرا پہلو یہ ہے کہ ناقابل عبور گروہی تقسیموں یعنی polarization کو ختم کر کے باہمی مکالمہ' افہام و تفہیم' لو اور دو' رواداری' احترام کے ذریعہ اہم قومی مسائل پر زیادہ سے زیادہ اتفاق (consensus) پیدا کیا جائے' اور جہاں اختلاف ختم نہ ہو سکے اسے جمہوری ذرائع سے حل کرنے کی پابندی کی جائے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ باہمی دشنام طرازی' خصوصاً بڑے بڑے گروہوں کی حب الوطنی پر کیچڑ اچھالنے سے اجتناب کیا جائے۔ پبلک طرزِ عمل اور پالیسیوں پر شائستہ زبان و انداز میں سخت سے سخت تنقید کی جائے' مگر غیر ثابت شدہ الزامات کی بنیاد پر مطعون و متہم نہ کیا جائے۔

اگر ۳۷ فی صد ووٹ حاصل کرنے والی پیپلزپارٹی دہشت گرد اور ملک کی غدار ہے' اگر کراچی کے عوام کی بھاری اکثریت کی منتخب کردہ ایم کیو ایم بھی دہشت گرد اور ملک کو توڑنے کے لیے تیار ہے' اگر عوام کے ووٹوں سے برسراقتدار آنے والی آئی جے آئی کے حکمراں ملک کو بیچ کھا

رہے ہیں' تو ہر ہوشمند انسان کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اب یہ ملک خودکشی کا فیصلہ کر چکا ہے' اور کوئی مصلح' قوت کی کسی بھی مقدار کو استعمال کر کے 'اس کو ہلاکت اور تباہی سے نہیں بچا سکتا۔ لیکن ہماری نظر میں ایسا نہیں۔ رواداری' مکالمہ اور احترام سے ان سب قومی قوتوں میں سے شریر عناصر کو ممیّز کر کے الگ کیا جا سکتا ہے' اگر ایسے عناصر ان میں ہیں۔ لیکن جو خود ننگے ہوں وہ دوسروں کو کپڑے کیوں کر پہنا سکتے ہیں' اور جو خود شیشے کے گھر میں ہوں وہ دوسروں پر پتھر کیوں پھینکیں۔

چوتھا پہلو یہ ہے کہ سیاسی اصلاح کے لیے قوت کا استعمال ختم کر دیا جائے۔ قوت سے نہ قبلہ بدلتا ہے' نہ قیادت بدلتی ہے' نہ کسی کی جگہ دلوں سے ختم ہوتی ہے۔ بلکہ الٹے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

جو پہلو بنیادی ہیں ان میں صداقت و دیانت اور عدل و انصاف کے علاوہ سب سے اہم قومی مقصد سے وابستگی' محبت اور وفاداری ہے۔ یہ قومی مقصد اسلام کے علاوہ نہ اور ہے' نہ ہو سکتا ہے۔ اس موضوع پر انشاء اللہ ہم آئندہ کبھی تفصیل سے لکھیں گے۔